پس حجاب

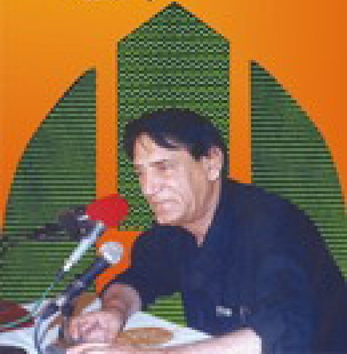

آغاز کیسے ہوا......؟

میرا طرزِ زندگی ذرا سا مختلف رہا ہے۔ یہ بہت عام سا نہیں ہے۔ میں نصابی کتابوں کا بہت پڑھنے والا، بلکہ بے اندازپڑھنے والا لڑکا تھا، جو اپنی کتابوں کے علاوہ یہ چاہتا تھا کہ دیمک کی طرح ہر صفحہ چاٹ جاؤں۔ میرے اندر تجسس بے پناہ تھا۔ آپ دیکھیں میرا تعلیمی ریکارڈ بڑا خراب ہے۔ میں اتنا تھوڑا سا کام کر لیتا تھا کہ ایف اے، گریجویشن اور ایم اے کر لوں۔ سوا سوا سال کلاسوں میں نہیں گھستا تھا اور اس چکر میں رہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ اقسام کا علم حاصل کرلوں۔

زیادہ سے زیادہ ورائٹی کا تھوڑا سا ثبوت آپ کو دے دوں۔ میں نے فرسٹ ایئر میں ڈاکٹر ژواگو کو بھی پڑھا ہوا تھا۔ بخاری کی حدیث بھی اور موپساں کے 88 افسانے بھی پڑھے ہوئے تھے۔ میں ایک وقت میں تقریباً تمام ہی علوم پر کنٹرول رکھتا تھا۔ اس وقت مجھے خیال نہیں تھا کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں۔ شاید میرا اندر عجب تھا۔ ایک انا تھی کہ مجھے دنیا کا سب سے علم رکھنے والا شخص ہونا چاہیے۔ میرے اس تنگ نظر ے خیال کا باعث تھا کہ مجھے کوئی فرد کسی بھی انفارمیشن کے میدان میں ممکنہ حد تک چیلنج نہ کر سکے۔

یہ خالی مشرق کی بات نہیں تھی۔ میں مغرب کو بھی سامنے لے کر چل رہا تھا۔ رسل، وائٹ ہیڈ، ہیگل یا برگساں سے۔ اس میں مجھے کوئی عجیب وغریب حادثہ نہیں پیش آیا، نہ کوئی شکستہ دل کا معاملہ تھا۔ میں قدرتی علم میں تجسس کی وجہ سے اتنا کچھ پڑھ رہا تھا، تو علم ایک حد کے بعد ختم

ہو جاتا ہے۔تھوڑا سا لٹریچر ہے میتھالوجی، فلاسفی ہے ان کو آپ پڑھ لیتے ہیں۔سائنسز ہیں۔یہ اتنی زیادہ نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ ایم ایس سی فزکس کریں۔اگر آپ کو فلسفہ طبعیات کا پتہ ہے، تو پھر آپ کو آئن سٹائن کی تھیوری جاننے کے سوال میں دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ جب فلسفہ اور سائنس ختم ہو گئے، تو میں حیران ہو گیا۔اتنے نالج سے میرے تجسس کو جو اطمینان ملنا چاہیے تھا، وہ میسر نہیں آ سکا۔فرسٹریشن سے زیادہ میرا درد بڑھ گیا۔یعنی جس چیز کو میں نالج ایبل Entity کہتا تھا، وہ نالج ایبلٹی نہیں تھی، وہ اشیاء کے بارے میں چند معلومات تھیں۔ یہ سچائی نہیں تھی، وہ محض تعلق کا علم تھا۔یہ چیز اس اصول کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔اس میں کوئی بھی فطرت اشیاء کا علم نہ تھا۔سادہ تعلق کی بات تھی۔اس وقت مجھے بہت کرب محسوس ہوا۔

اس کرب میں میرے پاس پانچ جدید فلسفے ایک وقت میں موجود تھے اور یہ پانچوں کے پانچوں خدا کا انکار کرتے تھے۔ بظاہر یہ لگتا تھا کہ یہ سارے علم وتعلم انکار کو جا رہے ہیں۔بغیر اللہ کو وقت دیئے، کسی تصور کو جانچے اور اعلیٰ فکری سطح پر اس کو پرکھے بغیر آپ اللہ کا انکار کر رہے ہیں۔ایک دم اتھراپالوجسٹ نے بغیر تحقیق کیے کہہ دیا کہ اللہ انسان کی ضرورت نہیں۔جس چیز کے بارے میں کوئی تحقیق نہیں کی، اس کے بارے میں رائے دے دی۔ میں نے چانس لے لیا۔آٹھ سال خدا کے تصور پر غور وخوض کیا اور آٹھ سال کے بعد میں ناک آؤٹ ہو چکا تھا۔ مجھے حتمی دلائل مل گئے، جو آج تک خدا کے بارے میں ٹوٹ نہیں سکے۔ میں خدا کے فیور میں نہیں تھا۔میں انسان کی آزادی کے فیور میں تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ میری آزادی اور غلامی میں ایک چیز حائل ہے اور وہ اللہ ہے۔ میں اللہ کو کیسے مان لیتا۔ مجھے سب سے مشکل، عجیب اور سب سے بڑا دشمن، جو انسان کا لگتا تھا، وہ خدا کا تصور تھا۔اس وجہ سے میں اس تصور کے بہت خلاف تھا۔ میں نے بہت محنت اور بڑی کوشش کی، مگر میں اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا۔میرے تمام اعتراضات، شکوک وشبہات اور میرے دانشورانہ تجسس میں جو شک وشبہ پیدا ہوا تھا، وہ ختم ہو گیا۔ جب یہ ایک دفعہ ختم ہو گیا، تو خدا مستحکم ہو گیا۔ یہ ایک بہت طویل دلیل کا سلسلہ اور پورا تھیسس ہے، جو آج تک میں مرتب نہیں کر سکا۔

چنانچہ سب سے پہلا لیکچر جس موضوع پر میں نے دیا، وہ تھا Allah is the top priority۔اللہ ترجیح اول ہے۔ میں نے اس پوری تحقیق کو ایک گھنٹے میں ایک چھوٹی سی دلیل کی صورت میں واضح کیا۔No argument against him۔میرا اگلا فیصلہ یہ تھا کہ آیا اس کی

طرف جانا جائے کہ نہ جانا جائے۔ یہ جاننے کے بعد بھی یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ادھر جانا ہے یا نہیں۔ نہ جانا ناممکن تھا۔ جانا ہی ممکن تھا۔ جب ہم جانے کا نام لیتے ہیں، تو وہ حق میں آگے بڑھنے کو متصور کرتے ہیں۔ اس کا پہلے حصے سے کوئی تعلق نہیں۔ تصوف وہ تحریک ہے جس میں وکیل اور اچھی طرح خدا کو جاننے کے بعد، آپ اس کے قرب اور ہمسائیگی کے لیے پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ اس کو ہم تصوف کہتے ہیں۔

پہلا قدم ہے دلیل۔ ذہن کا پوری طرح صاف ہونا۔ اسے قرآن علم الیقین کہتا ہے۔ وہ علم آپ نے حاصل کرلیا، یا اس کا مظہر ہے۔ آپ اپنے طور پر اظہار کررہے ہیں۔ اللہ کو اول ترجیح مان کر اس کے رستے میں آنے والی مشکلات کے ساتھ رہنا شروع کرتے ہیں اور سب سے بڑی مشکل جو رستے میں آتی ہے، وہ آپ کی اپنی انا ہے۔ خواہشات نفس، تردوات اور احساسات ہیں۔ آپ کے افسانوی اور تابناک تصورات ہیں۔ آپ کا تجسس ہے۔ یہ تمام آپ کے رستے میں حائل ہوتے ہیں۔ آپ ان رستوں سے گذرتے ہیں۔ اللہ کی نشانیاں اور مظاہرات دیکھتے ہیں۔ اسباب کو منقطع کیا جاتا ہے اور پروردگار اکیلے ہی آپ کو صرف اپنے وجود کی دلیل مستحکم کرتا جاتا ہے، اس کو ہم عین الیقین کہتے ہیں۔

جب خدا کے خیال سے گذر جائیں اور مشاہدے سے آپ بیزاری کا اعلان کردیں، تو کہتے ہیں، NO more to see anything about God اب آپ یہ نہیں کہتے کہ اے پروردگار اگر پانچ کا نوٹ میرے رستے میں پڑا ہوا نظر آیا، تو میں آپ کو مان لوں گا۔ اب آپ کو مشاہدات کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایک بھی مشاہدہ نہ ہو، تو بھی آپ اللہ کو اسی طرح مانتے ہیں، جیسے پہلے مانتے تھے۔ جب یہ مقام آجائے، تو پھر حق الیقین کا مرحلہ آتا ہے۔ اس سطح پر آکر خدا وصال سے محسوس نہیں ہوتا، فراق سے محسوس ہوتا ہے۔ جب آپ کے ساتھ ہوگا، آپ نارمل ہوں گے۔ جب آپ کے ساتھ نہیں ہوگا، آپ بےچینی محسوس کریں گے۔

حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو خط لکھا۔ اس نے اپنے لاؤلشکر کو اکٹھا کیا اور کہا، مجھے ایک زبردست بادشاہ کا پیغام آیا ہے۔ کیا صلاح دیتے ہو؟ درباریوں نے کہا، ہم نے تمہارے لیے پہلے بھی بہت بڑی فتوحات حاصل کی ہیں اور بڑی جانفشانی سے لڑے ہیں، تو حکم دے، ہم لڑیں گے۔ ملکہ سبا نے کہا کہ بادشاہ جس بستی میں داخل ہوتے ہیں، اسے اجاڑ اور ویران کرتے

ہیں اور اس کے امراء اور رؤسا کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا بالکل اسی طرح اللہ جس جسم میں داخل ہوتا ہے، اس کو پہلے تباہ و برباد کرتا ہے اور دل میں خواہشات اور آرزوؤں کے جو بڑے بڑے امراء بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے سر نیچے کر دیتا ہے۔ جب وہ اس بستی کو اچھی طرح اجاڑ لیتا ہے، تو خود آپ آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ پھر یہ بستی از سرِ نو آباد ہوتی ہے۔ پہلے اس تعمیر کو ویران کرتے ہیں، پھر اس تعمیر کو دوبارہ استوار کرتے ہیں۔ یہی کار تصوف ہے۔ یہی اللہ کا طریق ہے لیکن اس میں کوئی غیر معمولی واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔

کسی خاص مکتبۂ فکر سے تعلق

مکتبۂ فکر (School of thought) سے مراد یہ ہے کہ عالم اسلام کے آغاز سے جو اعلیٰ ترین مفکرین تھے، جو تاریخ اسلام کے ہر دور میں بڑے استادوں کی حیثیت سے گذرے ہیں۔ حسنؓ ابن علیؓ سے آغاز کیجیے جو All Time Top Intellectual ہیں۔ پھر خواجہ حسن بصریؒ، جنید بغدادیؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تھے۔ اس سکول کی کوئی حدود اور کوئی چاردیواریاں نہیں ہیں۔ مگر جوان میں عمومی انداز ہے، میں اس کو سکول کی حیثیت سے پہچانتا ہوں۔ میرے فوری شیخ سید علی عثمان ہجویری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ ان ساروں کی اپروچ میں بنیادی اور واضح فرق ہے۔ یہ بنے بنائے پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ یہ اعلیٰ ترین خصوصیات کے مالک ہیں اور بے پناہ علمی فراست اور جدوجہد کے بعد اپنے مسلک پر ایک یقینی اعتماد سے پہنچے ہیں۔ اپنے اپنے وقت میں یہ تمام بزرگ خدا کے وجود پہ دلیل و برہان بنے رہے ہیں۔

باطن میں جھانکنے کی صلاحیت

کسی بھی علم کے لیے جو دنیا میں وجود رکھتا ہے، بیک گراؤنڈ ڈیٹا بے حد لازم ہے۔ حتیٰ کہ غیر معمولی علوم میں بھی جیسا کہ یہ سمجھے جاتے ہیں، زائچے، ہاتھ کی لکیریں، یہ سب کچھ چاہیے۔ جہاں تک نفسیات کا تعلق ہے، کوئی ماہر نفسیات تب تک اپنی رائے دے ہی نہیں سکتا، جب تک وہ اپنا ہوم ورک پورا نہ کر لے۔ یہ ہوم ورک انٹرویوز، لائف ڈیٹا اور رویوں کے مطالعے وغیرہ پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ میں نے ایسا کوئی ڈیٹا جمع نہیں کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ شخصیات کے بارے میں رائے دیتے وقت میری کیا حیثیت ہوتی ہے، فیصلے سنانے سے متعلق دنیا میں اگر بہترین علم بھی موجود ہے تو اس میں بھی کم از کم تیس فیصد غلطیوں اور کمیوں کا امکان ہوگا اور ان غلطیوں کی گنجائش کسی علم کے مثبت ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے برعکس منفی اور کالے علوم میں تناسب تین اور سات کا ہوتا ہے۔ یعنی تین باتیں ٹھیک ہوں، تو سات ضرور غلط ہوں گی۔

علاوہ ازیں، جتنے بھی ارتکاز توجہ کے آرٹ ہیں، وہ زندگی کے ظاہر سے متعلق رائے دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے پرسوں آپ جہاز پر جائیں گے اور کوئی کہتا ہے کہ بھئی تیرے تو گھر میں بکری مری پڑی ہے۔ یہ ایک خارجی صورتحال کی نشاندہی ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا سپیشلسٹ موجود نہ ہوگا، جو بنیادی علوم کے توسط سے آپ کے اندرون ذات سے متعلق اپنی رائے دے۔ یہ فرق ہے اس علم میں جو خدا کی طرف سے ملتا ہے اور ان علوم میں، جو دنیاوی طور پر ترقی کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بے حد مشکل ہے کہ اس علم کا ذریعہ کیا ہے۔ اس میں میں نے کوئی غیر فطری رویہ اختیار نہیں کیا۔ دیکھیے کہ متعدد افراد جمع ہوئے اور جو مظاہرہ ہوا ہے، وہ محض مظاہرہ نہیں تھا بلکہ تمام افراد سے متعلق ایک فطری تفہیم تھی۔ اس میں شاید سو میں سے ایک غلطی کا امکان ہو کہ میں مکمل نہیں ہوں۔ علم درست سہی، لیکن میں مکمل طور پر درست نہیں ہوں۔ تھکن اور عجلت وغیرہ کے باعث کوئی بھی غلطی ممکن ہے۔

تاہم بنیادی بات، جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ یہ اللہ کا ثبوت ہے۔ یہ اس زمانے میں ایک برہان قاطع ہے۔ جب خدا کسی کو علم اور شناخت دینا چاہے، تو وہ ہر حال میں دوسروں سے آگے ہوتا ہے۔ یہاں جتنے مروجہ علوم کی شناخت موجود ہے آج یا کل، پاکستان سے امریکہ تک، زمین پر کوئی بھی شخص، جس کی ذمہ داری اللہ کے توسط سے مجھ پر عائد ہوگی، وہ ضرور اس امر کی صداقت کی گواہی دے گا کہ He has been able to understand me۔ اس بات کو مختصراً یوں کہیے کہ

He has been able to know me without my knowledge

مگر بعض اوقات انسان کے حجابات اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ ہم ایک شخص کو ایک بات بتا رہے ہوتے ہیں، مگر وہ انکار کیے جاتا ہے کہ یہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر ہم ثابت کرنے کی

کوشش کریں کہ یہ بات تم میں ہے، تو سوالات کا کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ But should I be so much interested in any body?

ہمیں تو غرض ہے کہ ایک بندہ اصلاح کار، اصلاح ذات اور توجہ علی اللہ کے لیے آتا ہے۔ ہمیں اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی بھی کرنا ہے اور اس کی اچھائیوں کی بھی، تاکہ وہ آگہی کے ساتھ آگے بڑھے۔ اس کو کہتے ہیں، من عرف نفسہ لقد عرف ربہ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے گویا اپنے رب کو پہچان لیا۔ یہ سائنس آپ کی اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے۔ ہم حیاتیاتی اور کیمیائی سطح پر ایک اکائی ہیں۔ ہم میں سے ہر ہر آدمی، آپ اور میں کوئی مختلف نہیں ہیں۔ اسی لیے صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بھی شخص کی کسی بھی کمزوری کا مذاق اڑانے کا حق نہیں رکھتا۔ کوئی بھی وقت ایسا آ سکتا ہے کہ آپ کی کیمسٹری بالکل اسی طرح ہو جائے، جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ سوبچوں کا قاتل جاوید اقبال بھی انسان تھا اور آپ بھی۔ اگر اس کی کیمسٹری کا فرق اسے سوبچوں کا قاتل بنا سکتا ہے، تو یہ خوش ہونے کی بات نہیں، ڈرنے کی بات ہے کہ مجھ پر اللہ کا احسان ہے اور باوجود اسی کی طرح کا انسان ہونے کے، میں اگر اس عادت یا حالت سے بچا ہوا ہوں، تو یہ اللہ کی مہربانی ہے، توفیق اور احسان ہے ورنہ Diabolically speaking ہم سب ایک سے ہو سکتے تھے اور ایک سے عمل کر سکتے تھے۔

بھٹکنے سے بچ گئے

علم میں ایک صفت بہت بڑی ہے۔ اگر آپ نتائج علمیہ کو دیکھیں، تو سب سے پہلے نتیجہ ہمیں یہ علم دیتا ہے کہ تکبرات و تمام تفاخرات جہالت کی اقسام ہیں۔ علم کے مثبت نتائج آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھتے ہیں۔ ہماری اس زمین میں جن دو چار امراض سے میں آگاہ ہوں، ان میں ایک خود ساختہ اصطلاح Religious Schizophrenia بہت عام ہے۔ کسی کو تھوڑا سا مذہبی کلام یا دو چار مسائل آ گئے، یا کسی نے تھوڑا سا بولنا سیکھ لیا، تو ان میں سے ہر کوئی مہدی بننے کا خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ تمام علماء، جو کچھ بولنے اور مسائل کو تھوڑا سا جاننے کے قابل تھے، انہوں نے اپنے ساتھ لفظ امیر لگانا اور جماعتیں بنانا ضروری خیال کیا۔ یہ تفاخرات تمام کے تمام ان کی جہالت کا حصہ بنتے چلے گئے۔ نہ صرف انہوں نے اپنے آپ کو، بلکہ اپنے ساتھ بے

شمار لوگوں کو گمراہ کیا۔

مذہب میں کسی قسم کے گروہ کی تخلیق کی گنجائش نہیں۔ میں عام لوگوں میں بیٹھ کر عام انداز میں اللہ اور رسول کی بات کرسکتا ہوں۔ جب کوئی گروہ بنتا ہے اور کوئی فکری رستے علیحدہ کرتا ہے، تو وہ عجب اور تکبر کے رستے پر چل نکلتا ہے، اور خیال کرتا ہے کہ میں تو برتر ہوں اور میرا بھائی اتنا برتر نہیں ہے۔ میں اپنے دوسرے بھائی کے بارے میں یہ سوچوں کہ وہ مجھ سے کمتر ہے، اس کا مذہب ٹھیک نہیں ہے۔ میرا مذہب ٹھیک ہے، تو اس کا مطلب ہے میں ایک ایسا مذہبی ہوں جو عجب سے کام لے رہا ہوں اور یہ کبھی میری نجات کا باعث نہیں بن سکتا۔ یہ ان تمام بڑی تنظیمات والوں میں خرابی تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھنا شروع کردیا ہے۔ اپنے آپ کو متقی کہا، حتیٰ کہ ایک جماعت والوں نے صالحین والے لفظ استعمال کیے، جو صرف اللہ نے قرآن میں پیغمبروں کو کہا۔ دوسروں کو انہوں نے باہر نکالا اور پھر ان کی اصلاح کے درپے ہوئے۔

ان سب کے پیچھے ایک مذہبی انقلاب لانے کا تصور تھا۔ ایک عام سے مغربی نے ایک بڑی خوبصورت سی بات کی ہے۔ ان تمام لوگوں کا علم اکٹھا ہو کے بھی ایک عام سے مغربی کے برابر نہیں۔ اگر ایک مذہبی عالم کو اس کا مطلب معلوم ہو جائے تو وہ یقینی طور پر ایک اچھا مسلمان بن جائے۔ اس نے کہا Nobody can stop a revolution the time of which has come. کہ کوئی شخص اس انقلاب کو نہیں روک سکتا، جس کا وقت آچکا ہے۔

قابلِ غور بات ہے کہ یہ لوگ گزشتہ ستر برس سے وہ انقلاب لانے کی کوشش کررہے ہیں، جس کا وقت نہیں آیا۔ طاہر القادری بھی یہی کررہے ہیں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی یہ کرتے کرتے فوت ہوگئے اور ڈاکٹر اسرار بھی اسی لائن میں لگے ہیں۔ ان کو ایک بات سمجھ ہی میں نہیں آتی کہ اللہ نے ان کے ہاتھوں اس تبدیلی کا وقت مقرر نہیں کیا اور وہ وقت ابھی آیا ہی نہیں۔ وہ اللہ پر اپنی پسند و ناپسند کو مسلط کررہے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو متقی ڈیکلیئر کرکے خدا سے اس کا وقت اور اس کی رضا چھیننا چاہتے ہیں۔ کم از کم کوئی سادہ سا پڑھا لکھا مسلمان اس حماقت کا شکار نہیں ہو سکتا۔

تحقیق و جستجو و اخلاص

میری اپروچ یہ رہی ہے کہ میں اللہ پر اندھا دھند یقین نہیں رکھنا چاہتا۔ میری مشقت اس لیے بڑھ گئی کہ میں ایک باضابطہ نظریاتی اساس اور تحقیق و جستجو کے باعث اپنے خدا کو دلائل میں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا ہوا، اگر خدا نظر نہیں آتا۔ ہوا بھی مجھے نظر نہیں آتی، لیکن اس کا احساس مجھے ہے۔ اگر خدا نظر نہیں آتا، تو اس کا یہ قطعاً مطلب نہیں کہ خدا محسوس نہیں ہو سکتا، مل نہیں سکتا یا کسی اور نظر سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ ہم بہت ساری ایسی چیزوں پر یقین رکھتے ہیں، جن کا وجود نظری نہیں ہے۔ ان میں ایٹم کے ذرات وغیرہ شامل ہیں۔ انسان نے ایسی سینکڑوں چیزوں کو تسلیم کر لیا، جو کہ دکھائی نہیں دیتیں۔ مگر وہ کسی نہ کسی تجربے اور مشاہدات میں آ جاتی ہیں۔

اب اللہ کو اس سطح یا کسی اینلیٹیکل دلیل کے ذریعے اپروچ کرنا، ہو سکتا ہے کہ ہر آدمی کا کام نہ ہو۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب کی وجہ سے دنیا آج تک آباد چلی آ رہی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کے اولیاء بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح ہوں گے اور بنی اسرائیل کے پیغمبروں کا واحد کام نبوت تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہادت غیب ہی میں اللہ ہے۔

اسی طرح حضورؐ جب دنیا سے رخصت ہوئے، تو ظاہر ہے کہ پیچھے بہت بڑا خلا پیدا ہوا۔ ایک ایسا خلا، جس میں ذاتی شہادتیں کم ہو گئیں۔ اس لیے امت مسلمہ کے اولیاء نے ذاتی مجاہدات اور ریاضتوں کے ذریعے وہ شہادت حاصل کی اور تاریخ ان سے بھری ہوئی ہے۔ قریباً دنیا کے ہر خطے میں جہاں مسلمان آباد ہیں، اولیاء کرام وہاں موجود رہیں گے اور قیامت اس وقت قائم ہوگی، جب زمین پر ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا شخص نہیں رہے گا۔ بحران یہ نہیں کہ اولیاء اللہ نہیں رہے، سب سے بڑا بحران اولیاء اللہ کی پہچان ہے۔ اس وقت اتنا کنفیوژن اور اتنا جھوٹ شامل ہو گیا ہے، جو ہمیں بنی اسرائیل کے زمانے میں، حضرت دانیال علیہ السلام کے دور میں نظر آتا ہے۔ وہاں ایک وقت میں سو جعلی پیغمبر اور ایک اصلی ہوتا تھا۔ نبی کی اس وقت پہچان خدا کی جانب سے خصوصیت تھی کہ کیا ملتی ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کو اس لیے نبی مانا گیا کہ انہوں نے بادشاہ وقت کے اس خواب کو بیان کیا، جو اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ میں نبی اس

کو مانوں گا، جو میرا خواب مجھے سنائے گا۔ وہ خواب میں زبانی نہیں بتاؤں گا۔ اگر کوئی نبی ہے، تو اسے پتہ ہونا چاہیے کہ میں نے کیا خواب دیکھا ہے اور اس کی تعبیر کیا ہے۔ جبریل امین تشریف لائے اور حضرت دانیال کو خواب اور اس کی تعبیر بتائی۔

بسا اوقات ہمارا مسئلہ یہی ہوتا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس بحران کا شکار رہا ہوں۔ سب سے بڑا بحران یہی ہے کہ ہم اللہ کے بندے کو پہچان نہیں پاتے۔ یہ سوال میں نے اپنے شیخ و مرشد سید ہجویریؒ کے پاس جا کر پوچھا کہ آپ نے لکھا ہے، آپ نے خراسان کی پہاڑیوں میں ۵۶۳ اولیاء اللہ دیکھے۔ اب ہم کیا کریں کہ ۵۶۳ تو کجا، یہاں جوتیاں چٹخاتے مدتیں گذر گئیں۔ جسے دیکھتے ہیں، اول کم علم ہے۔ دوسرا Claimant (دعوے دار) ہے، تیسرا غیر مرئی قوتوں پر مقدار علم کی بنیاد رکھتا ہے اور چوتھا تنظیمی طاقت طلب کر رہا ہوتا ہے۔ ان سب عناصر کے ہوتے ہوئے ہم کیسے کسی پر اعتبار و اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔

یہ سوال کر کے جب میں واپس آیا، تو بے حد رنجیدہ تھا۔ دیکھا کہ ''کشف المحجوب'' سامنے پڑی ہے۔ ایسے ہی بے دھیانی میں صفحہ الٹ دیا، تو دیکھا کہ ابوسعید مخزومی کا یہی سوال موجود ہے۔ شیخ ہجویریؒ نے جواب میں لکھا ...... اور اس کو محض حسن اتفاق نہیں کہا جا سکتا ...... کہ جب ہم خدا کی تلاش میں نکلے، تو ایسے بہت سے اولیاء اللہ اور برگزیدہ بندے نظر آئے، جن سے ہم نے سبق سیکھا۔ ان کی دعائیں لیں اور برکتوں سے آشنا ہوئے۔ اے سائل ایک وقت ایسا آئے گا کہ تو زمین ڈھونڈ مارے گا اور تجھے خدا کا بندہ نظر نہیں آئے گا۔ پھر کیا تجھ پر لازم ہے کہ تو خدا کی تلاش چھوڑ جائے؟ بس اتنا یقین رکھنا کہ جس اللہ نے پچھلوں کو دیا ہے، وہ زندہ و جاوید تجھے بھی عطا کرے گا۔ اس دن کے بعد میری وہ مایوس کن کوشش، یعنی خدا کا بندہ ڈھونڈنے کی ختم ہو گئی۔

میں نے سوچا، یہ سچ ہے کہ خدا زندہ ہے۔ بندے کا حق خدا کو پہچاننا اور خدا کا حق بندے سے اپنی عبادت کی تسلی لینا ہے۔ یہ پہلی Equaltion ہے، جو ہر آدمی میں موجود ہے اور چاہے اسے استاد یا ولی اللہ ملے نہ ملے، یہ اس کا بنیادی حق اور اللہ پر یہ لاگو ہوتا ہے کہ وہ اسے عطا کرے۔ بندگی کے لیے دو چیزیں لازم ہیں۔ ایک اخلاص اور ایک ذکر خدا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ولایت کے اس معیار تک نہ پہنچے، جو شیخ عبدالقادرؒ، علی عثمان ہجویریؒ یا جنیدؒ بغدادی کا ہے۔ مگر وہ خدا کا بندہ ضرور ہو سکتا ہے اور مقبول ترین بندہ بھی۔

اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تعلیمی اور علمی معیار بلند ہو۔ قرآن حکیم میں اللہ فرماتا ہے کہ جس کے چاہتا ہوں، درجات بلند کرتا ہوں اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی اساسی اور بنیادی علم موجود ہو، مگر وہ خدا کی دوستی سے محروم ہو۔ خدا کی دوستی شرط ہے۔

تصوف کی مشکل لائن

تصوف کی لائن مشکل نہیں ہے۔ یہ ایک انٹلکچوکل سوال اور ایک ذہنی اپروچ ہے۔ اس میں آپ اپنے ذہن کو تیار کر لیتے ہیں کہ میں نے خدا کا انتخاب کرنا ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ تصوف کی کیا تعریف کریں گے؟ میں نے کہا کہ معقول وقت میں معقول ذرائع عقل کے ساتھ جو شخص خدا کو ترجیح اول چن لیتا ہے، اور باقی زندگی اس اجتہاد میں صرف کرتا ہے، وہ صوفی ہے۔ یہ مشکل نہیں ہے۔ لوگ اسے مشکل اس لیے کہتے ہیں کہ وہ معیار اعلیٰ سے شروع کرتے ہیں۔ ہم شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کا معیار لیتے ہیں۔ وہ قطب عالم اور غوث زمانہ تھے۔ ہم ایسی ہی اور بڑی ہستیوں سے معیار لیتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ بات یہ ہے کہ معین الدینؒ اور فرید الدینؒ نے ایک دن آغاز بھی کیا تھا۔ تب وہ معین الدین نہیں تھا۔ ایک سادہ سا لڑکا تھا، جب ابوالحسن خرقانی ان کے پاس آئے۔ لڑکے کا روشن ماتھا دیکھا، اسے کہا، انگور لاؤ۔ انگور چبایا۔ اس کے منہ میں رکھا۔ اس سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک دعا دی، اے پروردگار! یہ ایک لڑکا ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ تحصیل علم دین کی طرف جائے۔ تب اس نے کام چھوڑا۔ بارہ برس سفر کیا۔ صحرا صحرا پھرے۔ علم حاصل کیا۔ ہندوستان آئے اور ہند الولی ہوئے۔

آپ لوگوں کو معراج سے دیکھتے ہیں۔ آغاز سے نہیں دیکھ رہے۔ جب ان کو آغاز سے دیکھو گے، تو آپ ان میں سے ایک ہو جاؤ گے۔ یہ بڑا آسان لگے گا۔ اس لیے کہ اللہ نے قرآن میں دو ولی گنے ہیں، تیسرا نہیں۔ اللہ ولی الذین آمنو یخرجھم من الظلمات الی

النور ۔اللہ ولی ہے اہل ایمان کا کہ ظلمتوں سے نکال کر انہیں نور کی روشنیوں میں لے جاتا ہے۔ والذین کفرو اولیھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات اور اہل کفر طاغوت کے ولی ہیں۔ ان کو روشنیوں سے اندھیروں کو لے جایا جاتا ہے۔ زمین پر دو ولی ہیں اور تیسرا کوئی نہیں۔ وہ جو ظلمات سے نور کو جا رہے ہیں اور وہ جو نور سے ظلمات کو جا رہے ہیں۔ وہ جو حجاب سے کشادگی اور جو کشادِ قلب سے حجاب کو پلٹ رہے ہیں۔ تیسرا کوئی ولی نہیں ہے۔ ہر انسان کا ولایت پر حق ہے، کیونکہ انسان کو پیدا ولایت ہی کے لیے کیا گیا ہے۔

اس لیے یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ انسانوں میں خدا معیار پرکھتا ہے۔ ہاں ان کو اپنے اپنے مقامات پر فکس کر دیا جاتا ہے۔ ایک عام آدمی ولی ہو سکتا ہے چاہے وہ موچی ہو۔ موسیٰ کو اللہ نے کہا، میں بیمار ہوں۔ اس نے کہا، یا اللہ! تو بیمار بھی ہوتا ہے۔ ہاں ہاں جب میرا کوئی دوست بیمار ہوتا ہے، تو میں بیمار ہوتا ہوں۔ تم اس کی عیادت کو جاؤ۔ موسیٰ گیا، تو اس نے دیکھا، ایک موچی ایک بڑی ساری جوتی لے کے بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے، اے اللہ! میں بیمار ہو گیا ہوں۔ مجھے تیرے سائز کا نہیں پتہ۔ مگر میں نے بڑی محنت سے یہ جوتی بنائی ہے، ہو سکے، تجھے پوری آ جائے، ورنہ میری خطا معاف فرما دے۔ حضرت موسیٰ روئے اور کہا یہ واقعی اللہ کا ولی ہے۔ وہ انٹلیکچوئل اور کوئی بڑا دانشور نہیں تھا۔ مگر اللہ نے اس کو احساسات کی Refined ذہنی سطح دی تھی۔ ایسے ہماری دنیا میں ہزاروں ہیں۔

ہو سکتا ہے، ایک سیب بیچنے والا، جب ایک برے سیب کو اٹھانے لگے، تو اس کو اللہ کا خیال آئے اور کہے نہیں۔ اس نے اللہ کی وجہ سے گاہک کو گندہ پھل نہیں دینا، تو وہ اللہ کا ولی ہو جائے۔ ایک کمشنر جو سمجھ کر فائل پر غلط سائن کر رہا ہے، وہ اولیاء طاغوت میں شامل ہو جائے گا۔ بعض اوقات ایک ماہ انٹلیکچوئل انحراف کر سکتا ہے اور ایک بڑا سیدھا سا آدمی ترقی کر سکتا ہے۔

مذہبی تعلیمات بمقابلہ تصوف

روایتی میل جول مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جہاں بھی روایتی پیٹرن شامل ہوتا ہے، میں وہ راستہ نہیں رہتا، جو میں رہنا چاہتا ہوں۔ سیدھی سی بات ہے کہ ایک عام آدمی کا خدا پر حق ہے کہ وہ اسے چاہے اور خدا کا حق ہے کہ وہ اپنے کمزور ترین بندوں تک آئے۔

یہ میرے تصوف کا بنیادی تھیسز ہے۔ میں تصوف کو تخصیص نہیں سمجھتا۔ میرا سب سے مشہور لیکچر اس موضوع پر ہے کہ صرف تصوف ہی طرزِ زندگی طریقِ زندگی ہے۔ اپنی زندگی سے اسے آپ نکال نہیں سکتے۔ البتہ عمومی طور پر کبھی توبہ کی نیت سے اس لحہ تصویف کو پرکھتے ہیں اور کبھی زندگی میں مصائب و آلام میں خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہی تصوف ہے۔

ایک ہمہ وقتی رجوع کو آپ تصوف کہیں گے اور کبھی کبھار رجوع کو اور پھر اس کے بعد دوبارہ اپنی زندگی کے پیٹرن کو پلٹ جانا عمومی زندگی ہے۔ تصوف یہ ہے کہ آپ ہر حال میں، گناہ و ثواب اور زندگی کے شب و روز میں خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہی ہمارا طریقہ کار ہے۔ تصوف کبھی بھی غیر معمولی شے نہیں رہی۔ غیر معمولی شے اس میں صرف ایک ہے کہ کوئی مادی وجود والا بندہ کسی غیر مادی وجود کے ساتھ کتنا رابطہ رکھ سکتا ہے۔ اکثر لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ پروفیسر صاحب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم جو مادیت کی جکڑ بندیوں میں اردگرد کے آزاد اسباب میں الجھے ہوئے ہیں، ہم کیسے پروردگارِ عالم سے محبت کر سکتے ہیں، جو حواسِ خمسہ سے بہت ماورا ہے؟ ٹریپ بھی یہی ہے۔

لاہور میں ایک دفعہ انتہا درجہ کی گرمی پڑ رہی تھی۔ میں اس وقت تسبیح کر رہا تھا۔ میں نے اللہ میاں سے چلتے ہوئے سوال کیا کہ اے اللہ میاں! کیا تو بندوں کو بیوقوف سمجھتا ہے۔ اب تو ہی بتا کہ تو ذائقے، احساس اور نظر میں نہیں ہے۔ لوگ بیچارے کیا کریں، تجھے کہاں سے ڈھونڈیں؟ میرے دل میں خدا نے مجھے کہا کہ بندۂ خدا! اس کے علاوہ میں نے اور کیا ٹریپ رکھا ہے؟ یہی تو رکھا ہوا ہے۔ جو شخص حواسِ خمسہ سے ذرا سا آگے گذر گیا، مجھے پالے گا۔ تم آخر یہ کیوں نہیں خیال کرتے کہ یہ فریب اور یہ حواس جعلی ہیں۔ یہ پابندی کے حواس ہیں۔ یہ صرف وقتی طور پر زمین پر اپنے آپ کو سمیٹنے کے لیے دیئے گئے ہیں۔ اس زمین سے اوپر گلیکسیز میں، آپ خلا میں چلے جائیں، یہ سارے حواس ختم ہو جاتے ہیں۔ وزن اور ذائقہ ختم ہو جاتا ہے۔ تم کیوں نہیں غور کرتے کہ یہ تو حجاب ہیں۔ میں اس حجاب سے آگے بستا ہوں۔

حدیثِ قدسیہ میں خداوند کریم کا ایک ارشاد ہے۔ اس شخص کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آگ حرام ہوگی، جس کی آنکھ سے میرے لیے ایک آنسو بہا۔ میں نے بڑا غور کیا۔ اس آنسو کے لیے کہ جو میری وجہ سے نہ ہو۔ جو میری کسی اذیت، آرزو یا میرے کسی دکھ کی وجہ سے

نہ ہو۔ میری آنکھ سے وہ آنسو نکلے، جو صرف خدا کے لیے ہو۔ تو مجھے اندازہ ہوا کہ اللہ نے کتنی مشکل بات کی ہے۔ بظاہر کتنی آسان اور کتنا مشکل ہے اس پر عمل کرنا۔

مسئلہ یہ ہے کہ لوگ مجھ پر بڑی پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے یہ کیوں کیا، یہ کیوں نہ کیا؟ فلاں کام کیوں نہ کیا اور فلاں کیوں نہ کیا؟ لوگوں کے اپنے تصورات ہیں اور مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں اس کے مطابق زندگی گذاروں، جیسے کہ یہ دوسرے مسلمان ہیں۔ سب سے بڑا قانون یہ ہے کہ It is very common to be uncommon and it is very uncommon to be common. لوگ اعتدال کے دشمن ہیں۔ لوگ اس بندے پر اعتراض کرتے ہیں، جو اپنے آپ کو ایک پیٹرن میں نہیں ڈھالتا۔

ابھی میں نے سیاست میں حصہ لیا۔ ہم نے خدا کے فضل وکرم سے ضلع تک کے الیکشن کلیئر کیے۔ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ سیاست میں کیوں حصہ لیتے ہیں؟ سیاست تو جھوٹ ہے۔ میں کہتا ہوں، ٹھیک ہے، جھوٹ ہے۔ جب میں جھوٹ بولوں گا، تو تب مجھے بتانا کہ سیاست جھوٹ ہے۔ اگر بہت ساری جگہیں اصلاح اور بہتری کے لیے ہیں، تو میرا حق بنتا ہے کہ میں ادھر بھی اپنے اور لوگوں کے لیے ایک رابطہ وضع کروں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس ملک کی اصلاح کسی جنرل میں نہ کسی سیاستدان میں ہے۔ اس ملک کی اصلاح ہم لوگوں میں ہے۔

مگر ''ہم لوگوں'' سے مراد میں یہ نہیں لیتا کہ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں ہی امیر دعوت اصلاح ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں میں سے جو خدا کے حضور سربسجود ہوں گے، ان میں اخلاص کی ایک رتی ہو گی، تو خدا ان میں سے کسی شخص کو زمین کا حکمران کرے گا، بلکہ آسمان پر بھی سرفراز کرے گا۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ بہتر کرے گا۔ کسی جنرل یا کورکمانڈر کو نہیں۔ یہ آپ سیاست اور فوج میں جو ذلت وافلاس دیکھ رہے ہیں، سارے کے سارے وہ کام کر رہے ہیں، جو انہیں نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ اس کا جواب ہے، جسے خدا برکت دے گا۔

روحانیت کی طرف سفر

حضرت عیسیٰؑ سے پوچھا گیا، خدا کو کیسے پہچانیں؟ فرمایا Know thyself and shall know the God (اپنے آپ کو پہچانو، خدا کو پہچان لو گے) اسی طرح کا مشہور قول من

عرف نفسہ فقد عرف ربہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ حضورِ گرامیؐ سے جب اللہ کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا، اللہ جسے اپنا علم دینا چاہتا ہے، اس کی آنکھ اس کے اوپر کھول دیتا ہے۔ اب اگر ہم تینوں بیانات کو یکجا کریں، تو پتہ چلتا ہے کہ یہ عملی عبادات کا رستہ نہیں ہے۔ عملی عبادات کسی معاشرے میں گذر اور آشتی کے لیے بہت ضروری ہیں۔ نماز اجتماعیت اور ذاتیت بھی ہے۔ اسی طرح صدقات و زکوٰۃ اگر ایک سطح پر اس کی مخلوق کو راحت پہنچا رہے ہیں، تو دوسری سطح پر وہ اس کے اپنے اندر سے بھی بخل کو دور کر رہے ہیں۔ زکوٰۃ کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو بھی میل کچیل سے پاک کرتے ہیں اور اپنی اضافی رقم سے معاشرے کے ضرورت مندوں کی ضرورت کو بھی پورا کرتے ہیں۔ حضورِ گرامی مرتبتؐ نے فرمایا کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مسلمانوں کا تم پر حق ہے اور اس کو ہم صدقات کہتے ہیں۔ صدقات کی وسعت اتنی طویل ہے کہ ایک اچھی بات اور ایک اچھا کلام بھی صدقہ ہے اور ایک اچھا مشورہ اور ایک اچھا خیال بھی صدقہ ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں، جن کی معاشرتی زندگی میں مسلمان مشق کریں، تو اس سے ایک ایسی بنیاد مہیا ہوگی، جس میں خدا کے چاہنے والے نکل سکتے ہیں۔ سابقون الاولون میں خدا کو چاہنے والے جب اپنی ترجیح اول اللہ کو کرتے ہیں، تو وہ اپنے اعمال کا سارا رخ اس کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان اعمال میں عبادات کے علاوہ جو سب سے بڑا عمل ہے، وہ خدا نے خود ہی بتایا ہے۔ الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو کھڑے بیٹھے کروٹوں کے بل مجھے یاد کرتے ہیں۔ و یتفکرون فی خلق السموٰت والارض اور زمین و آسمان کی تخلیقات پر غور کرتے ہیں۔ سو یاد کرنا اور زمین و آسمان کی تخلیقات پر خدا کے حوالے سے غور کرنا، یہ دو باتیں اللہ کے بہت قریب لے جاتی ہیں۔

اب یاد کرنے کا طریق کار جو اللہ نے ہمیں بتایا ہے، وہ Power intoxicant نہیں ہے۔ خدا سے شیطان نے یہ کہا کہ میں تیری مخلوق کو دائیں بائیں آگے پیچھے سے آؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ٹھیک ہے، تم بہت سارے لوگوں کو گمراہ کرو گے، الا عباداللہ المخلصین مگر میرے مخلص بندوں کو تم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح ایک حدیث رسولؐ ہے کہ قیامت کے دن جب بہت سارے بندوں کو جنت لے جایا جا رہا ہوگا، تو خدا ملائکہ کو حکم دے گا، ان کو جہنم میں لے

جاؤ۔ ملائکہ عرض کریں گے، اے پروردگار! ان کے نامہ اعمال میں خوبیاں لکھ لکھ کے ہمارے صفحات ختم ہو گئے ہیں اور آپ فرما رہے ہیں کہ ان کو جہنم میں پھینک دو؟ اللہ فرمائے گا، میرا اور میرے بندے کا ایک معاملہ ہے، جسے میں ہی جانتا ہوں۔ وہ اخلاص ہے۔ سو خدا اور انسان کے درمیان محبت کی پہچان کی کسوٹی اخلاص ہے۔ اخلاص دنیاوی محبت کی بھی بنیاد ہے۔

اب محبت کے طریق میں سب سے بڑا طریق یاد ہے۔ وصال میں کسی محبت کا تعین نہیں ہوتا۔ جب فراق اور جدائی ہو گی، تو پتہ چلے گا کہ کس کو کس سے کتنی محبت ہے۔ فراق کا اصول یہ ہے کہ جو جتنا زیادہ یاد آئے گا، آپ کو اس سے اتنی ہی زیادہ محبت ہوگی۔ اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ محبت کو جاننے کا نہیں ہے۔ آپ کے دل اور کسی کی محبت کی آزمائش ایک تو فراق میں نمایاں ہوتی ہے یا فراق میں جس کی زیادہ یاد ہو، اس میں نمایاں ہوتی ہے۔

اب محبت ہمیشہ ان پانچ حواس خمسہ سے آگے چلی جاتی ہے۔ بظاہر اداس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود آپ اداس ہوتے ہیں۔ آپ نے کھانا بھی کھایا ہوتا ہے۔ خوشبو بھی لگائی ہوتی ہے۔ ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے، لیکن اس کے باوجود آپ لوگ اداس ہیں۔ حواس خمسہ سے آگے گذرتے ہوئے ایک ریفائن ادراک کو ہم اللہ کی محبت کہتے ہیں۔ جب تک ہم حواس خمسہ کی گرفت میں رہتے ہیں، ہم پر شرع غالب ہوتی ہے اور جب ذرا آگے Intellectual Refinement میں جاتے ہیں، تو پھر ہمیں اللہ بڑے واضح طور پر نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔

عملی طور پر بھی دیکھیں۔ جیسے لارڈ برٹرینڈ رسل نے کہا تھا کہ When we hit a wall, there is no wall and we have no fist. ہم کبھی بھی دیوار کو مکہ نہیں مارتے۔ مگر درد اور تکلیف اور اس کا احساس تو ہوتا ہے۔ مگر سائنسدان کہتا ہے وہ دیوار تھی ہی نہیں۔ یہاں مکا ہی کوئی نہ تھا۔ یہ تو الیکٹرون اور پروٹون کا جنونی رقص ہے۔ اگر عملی طور پر پروٹون اور الیکٹرون آپس میں مل جائیں، تو چین ری ایکشن میں ایک دنیا تباہ ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا بصری اور عملی پہلو جھوٹا ہے۔ اگر ہم سائنسدانوں میں یقین کریں، کہ ہمارا بصری پہلو جھوٹا ہے اور اس کی اصلیت یہ ہے کہ نہ وہاں دیوار ہے، نہ میں مکے کو مارتا ہوں۔ اس کے برعکس بڑی سخت سرکولیشن میں الیکٹرون اور پروٹون کے دائرے ہیں، جو کبھی بھی آپس میں نہیں ملتے

اوراگر یہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں، تو چین ری ایکشن ہو جائے اور شاید آدھی دنیا تباہ ہو جائے۔ تو ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ خدا کی ترجیح کو برقرار رکھنے کے لیے ہم اس کو یاد کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ خدا کی یاد کا اور کوئی مقصد نہیں۔

روحیت اور روحانیت

تصوف اور باقی علوم میں ایک بڑا فرق ہے۔ تصوف میں ذات کو خدا کے حق میں نفی کیا جاتا ہے۔ خدا کے لیے نفس کو مسترد کیا جاتا ہے، اس کی تردید کی جاتی ہے۔ یہ اکیس بائیس جبلتوں کا ایک پیکیج ہے، سنگل نہیں ہے۔ ہماری بنیادی جبلتیں ہیں، جیسے محبت، جارحیت اور سب سے پہلی بقا ہے۔ ہمیں پتہ ہے کہ بھوک لگتی ہے، تو بھوکا آدمی کفر کے قریب ہوتا ہے۔ اسے کچھ کھانے کو ملنا چاہیے۔ ورنہ وہ ہر چیز سے انکار کرے گا۔ مگر جب اٹھارہ جبلتیں ایک دوسری پر اثر انداز ہوتی ہیں تو اصل نفس پیدا ہوتا ہے۔ یہ نفس انسان اتنا پیچیدہ اور مشکل ہو جاتا ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص اسے سمجھ نہیں سکتا، بلکہ ایک ماہر نفسیات بھی اسے سمجھ نہیں سکتا کیونکہ تمام سائنسز اور تصوف میں ایک فرق ہوتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ پیچیدہ اور اعلیٰ سائنس ہے۔ یہ اعلیٰ ترین سائنس ہے، آرٹ نہیں ہے۔

تصوف ایک ایسی سائنس ہے کہ باقی سائنسز میں آپ کے احساسات شامل بھی ہو جائیں، تو نتائج پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ آپ ایک تجربہ کریں۔ چاہے آپ ناراض ہیں، بیمار ہوں، خوش یا ناخوش ہیں۔ آپ کے تجربے کی روٹین اور اس کے نتائج پر فرق نہیں پڑتا مگر تصوف میں آپ کا ایک ذرہ برابر وجود کا شائبہ اس میں شامل ہو جائے، تو آپ کی معروضیت اور آپ کے نتائج خراب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ اتنی پیچیدہ سائنس ہے کہ اس کے عدم توازن کو توازن میں بدلنا بڑا ہی مشکل ہے۔ اسی وجہ سے یہ علم دنیا کے مشکل علوم کے زمرے میں آتا ہے۔ بڑے سے بڑے فلاسفر بھی اس پیٹرن تک پہنچتے ہوئے تھک جاتے ہیں۔ چنانچہ تمام صوفیاء اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ تصوف سحر علمیہ ہے اور قرآن حکیم میں پروردگار عالم نے کہا کہ میں نے درجات، عبادات ظاہرہ میں نہیں رکھے۔

اس علم کی حدود سے اکتساب عالم کا وجود ہے۔ اسی سے اللہ کے بندوں کے درجات

مقرر ہوتے ہیں۔ یہ جو آپ سنتے ہیں، فلاں قطب عالم اور فلاں غوث زماں ہے یہ کوئی ایسی عجیب وغریب بات نہیں ہے۔ بڑی سادہ سی بات ہے کہ پاکستان کی انتظامیہ کے افسران کے مختلف درجے اور گریڈ ہیں۔ اسی طرح خدا بھی پوری دنیا کو دیکھتے ہوئے بہترین عقل واعتدال والے بندوں کا چناؤ کرتا رہتا ہے۔ آپ پرآ کر وہ چند بندے چنتا ہے اور پھر ان کے ٹیسٹ شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ گنا سڑنا ساری عمر جاری رہتا ہے۔ اسی طرح آپ کو ساری زندگی توازن کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ ایک ذرا سی تاخیر، ذرا سی سستی اور ذرا سا آنکھ کا جھپکنا شیطان کو موقع فراہم کر دیتا ہے۔

ذہنی اور روحانی سفر

یہ سب اکٹھے ہوتے ہیں۔ مگر ایک قانون ہے جو شاید ابتدا میں بندہ سیکھ لے، تو وہ بڑا کامیاب ہوتا ہے۔ اس کے بغیر خدا کے رستے میں ایک قدم بھی مشکل ہے۔ وہ یہ کہ اپنی ذات کے ساتھ ہمدردی حرام مطلق ہے۔ ہمارے علم میں جو خدا کو چاہتے ہیں، اپنے ساتھ کسی بھی قسم کی ہمدردی کو حرام سمجھتے ہیں۔ اگر آپ اپنے ساتھ ہمدردی کریں گے اور اس میں مصروف ہوں گے، تو آپ ایک نکتہ بھی نہیں سیکھ سکتے Any Sympathetic consideration about own self will never lead you to knowledge۔ وجہ یہ ہے کہ اگر آپ کہیں کہ میرے ساتھ اس بندے نے یہ کیا، اس کا مطلب ہے کہ میں حقدار نہیں تھا۔ اگر میں کہوں کہ میں نے یہ جاب حاصل کرنا تھا، دوسرا لے گیا، تو دوبارہ اپنی ذات سے ہمدردی کر رہا ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ میرا حصہ تھا، میرے باپ نے نہیں دیا، تو میں Self-sympathetic ہو گیا۔ ہماری زندگی کے ہر لمحہ حیات میں یہ ہمدردی کام کرتی ہے۔ فرض کریں، آپ کے باپ نے سب بیٹوں کو دیا، آپ کو نہیں دیا اور اگر آپ نے اللہ کو کہا، اے میرے مالک! میرے باپ نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ میں شاید یہی استحقاق کرتا تھا اور جناب سے مجھے یہی ملنا تھا، تو آپ ہمدری سے گذر گئے۔

اگر آپ کے ایک دوست نے آپ کی غیبت کی اور آپ نے سمجھا کہ اس نے تو اپنے

علم کے مطابق جو کہا، سو کہا۔ اگر میں بھی ایسا کرتا ہوں تو اس کا مطلب ہے، میں بدلہ لے رہا ہوں۔ میں یہ بھی سوچ سکتا ہوں کہ اس نے جو کچھ کہا، مجھ میں کچھ نہ کچھ خرابی ہو سکتی ہے۔ اپنی ذات کے ساتھ ہمدردی کرنے والا کبھی بھی خدا کی برأت کو نہیں پہنچ سکتا۔

تصوف اور سائنس میں ارتباط

میں نے دو تین اساتذہ دیکھے ہیں، جو شاید اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایران کے ڈاکٹر حسین نصر اور امریکہ میں کوئی ڈاکٹر ہیں۔ مگر میں نے وہاں ان کی کیسٹس سنیں۔ میں نے امریکہ میں تصوف کی ایک گروپ میٹنگ دیکھی ہے۔ وہاں شاذلیہ مسلک بے حد مقبول ہے، لیکن میں اس کے دروازے پر کھڑا پلٹ آیا۔ رات ایک بجے وہاں پہنچا، تو ذکر کا ایک حلقہ تھا، جس میں دف بج رہے تھے۔ چھوٹا چھوٹا ڈانس ہو رہا تھا اور اللہ ہو، اللہ ہو ہو رہا تھا۔

تقریباً ہر جگہ میں ہم نوع مذاق دیکھتا ہوں۔ شاید وہ اسلام میں اچھے اِکلِکٹو کل ہوں، لیکن دینِ اسلام کے کاز میں کمیٹڈ نہیں۔ میں گزشتہ پندرہ بیس برس استاد کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ میرے پاس پبلسٹی کے ذرائع بھی نہیں تھے اور نہ میں نے اختیار کیے۔ کئی مرتبہ مجھے ٹی وی پر آنا تھا اور اخباروں میں بھی۔ پھر جو کچھ بھی اخباروں نے میرے بارے میں لکھا، اپنے طور پر لکھا، جس میں میری کوئی مرضی شامل نہ تھی۔ بلکہ کچھ اخبار نویسوں سے مجھے گلہ بھی رہا کہ میں کچھ اور کہتا تھا اور انہوں نے کچھ اور لکھ دیا۔ As a teacher I don't want to see myself polluted by the high figures of miraculous happenings. بلکہ جو میں کہہ رہا ہوں، وہی لوگوں تک پہنچ جائے، تو میرا خیال ہے بہتر ہو گا۔

اگرچہ میں نے الہیات کی سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے آغاز کیا۔ تاہم، میں کبھی صاف ستھرا نہ تھا۔ تقدس کی فضا مجھ میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ میں جو ایک گندے، سڑے کالے کیچڑ سے پیدا ہونے والا آدمی ہوں، اپنے آپ کو مقدس کیسے کہہ سکتا ہوں یا دعویٰ پاکیزگی کر سکتا ہوں۔ ادھر خدا بھی کہتا ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم لوگ کتنے پاکباز ہو۔ اس صورتِ حال کے باوجود میں کم از کم ایک یکسوئی حاصل کرنے کی سعی کرتا رہا ہوں اور وہ یکسوئی شروع سے اللہ تعالیٰ نے مجھے نصیب فرمائی۔

انٹلیکچوئل جب دنیا کے فلسفوں کے مقابل اپنا سفر شروع کرتا ہے، تو شروع شروع میں بہت نظر ثانی کرتا ہے۔ میں بھی کبھی وجودیت (Existantialism) کی جانب مڑا، کبھی کمیونزم اور سوشلزم کو اعتقاد و ایمان تبدیل کیے بغیر کچھ عرصے کے لیے سراہا کہ عقیدہ تبدیل نہیں ہوتا، البتہ قابلِ سوال ہوتا ہے۔ میں خود اپنے ایمان کا محاسبہ کرتا رہا۔ اس کی کمی و بیشی دیکھتا رہا، لیکن کبھی اس پر نظر ثانی کی نوبت نہیں آئی۔ جب میں اس دلیل سلطان نصیر تک پہنچا...... و قل رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطاناً نصیرا اور میں نے استاد کی حیثیت سے آغاز کیا، تو قرآن حکیم کے الفاظ میں اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو چاہتا ہے کہ میں تیرے لیے کوئی بات کروں، تو کم از کم مجھے سلطان نصیر سے ضرور آشنائی عطا فرما۔ مشرق و مغرب میں متعدد لوگوں سے میں نے ملاقات کی، مغرب کے بڑے بڑے استادوں، یوگا کلچر کے چیف اور یہودی Oraclists سے ملا۔ ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے تسلیم نہ کیا ہو بلکہ وہ اتنے خوفزدہ ہوتے تھے کہ ڈر کر کہتے تھے، کیا تم ہمارا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟ میں ان سے کہتا کہ مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں، میرے ملک سے ایک دو کروڑ منافق مسلمان لے جاؤ، ان کو تبدیل کر لو۔ چہ جائیکہ، میں تمہارا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کروں۔ مجھے تمہارا کیا فائدہ؟

میں اس بارات عاشقانہ کو کیسے ضائع کر سکتا ہوں، جو خدا کی اپنی دین سے انسانوں کے دلوں میں ظہور پاتی ہے، وہ اخلاص، مروت اور محبت، جو اللہ کسی کے دل میں اپنے لیے ڈالتا ہے۔ جن آٹھ چیزوں پر دوزخ حرام کی گئی، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ نوجوان، جس کی آنکھ سے اللہ کے لیے ایک آنسو نکلتا ہے یہ آنسو عاشقی کی بارات ہے مگر وہ آنسو اپنے لیے، اپنی اغراض، غمِ جاناں اور غمِ دوراں میں نکلتا ہے مگر غمِ پروردگار میں نہیں نکلتا۔ وہ آنسو اخلاص کے بغیر نہیں نکل سکتا۔ ایک ذرہ برابر اخلاص آپ کو خدا تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر ہم اپنا تجزیہ کیوں نہیں کرتے؟ خدا سے دوری کس لیے ہے؟ کیا ہمارے مسائل کی وجہ سے ہے؟ کیا اس میں تنگ نظری، تنگ دلی اور ہمارے ہندوانہ کلچر کا عمل دخل ہے، جو ایک گرفت ہمارے مزاجوں، ہمارے برادری سسٹم اور ہمارے تمام ماحول پر رکھتا ہے۔

ہندو ہم سے خدائے واحد نہیں چھین سکا۔ اب بھی کسی مسلمان سے خواہ وہابی ہو یا

بریلوی، پوچھ کر دیکھ لیجیے، اللہ کتنے ہیں؟ وہ کہے گا کہ ایک ہی خدا ہے۔ صرف یہ حصہ بچ گیا۔ باقی سب کچھ وہ سمیٹ کر لے گیا۔ ہماری عادات اور معاشرت ہندووانہ ہے۔ ایک ہزار سال کے مشترک کلچر نے ہمیں دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ ہم زندہ رہنے کی سعی کر رہے ہیں۔ جو خدائے واحد کی پرستش کرتا ہے، وہ اتنا منافق نہیں ہو سکتا کہ ہر چڑھتے سورج کی پوجا کرے۔ وہ گنیش کی پوجا نہیں کر سکتا۔ اُمڈتے ہوئے بادلوں کے آگے ہاتھ نہیں جوڑ سکتا۔ اس سے ذرا اوپر خلا میں جانا پڑتا ہے۔ یہ وہ مابعدالطبیعیات ہے، جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی مابعدالطبیعیات نہیں رہ سکتی۔ مابعدالطبیعیت کا آخری حصول اللہ ہے اور اسلام کے سوا کسی کی مابعدالطبیعیت مکمل نہیں ہوتی۔ مسلمان کے سوا کسی کو اللہ نہیں مل سکتا۔

ہزاروں دھوکے اور فراڈ جو اس وقت جاری ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ یہ مذہب بھی خدا تک پہنچنے کی راہ ہے اور وہ مذہب بھی۔ اسی طرح سارے مذاہب اللہ تک پہنچتے ہیں۔ اگر پانچویں جماعت فائنل ہوتی، تو لوگوں کو پی ایچ ڈی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آدم سے لے کر محمدؐ تک مذہب، دین، ضابطہ حیات ایک ہی ہے مگر وہ کون سا عقلمند ہے، جو ایم اے کرنے کے بعد اپنے نام کی تختی پر میٹرک لکھے گا؟

ترقی آگے کی جانب ایک سفر ہے اور جب مذہب اور دین مکمل ہو چکا، تو رجعت انسانی عقل کا غیر مستحکم انداز ہے۔ اسلام کی طرف کیوں نہیں آتے؟ مگر بدقسمتی دیکھیے کہ اسلام کا مفسر اور اس کی تبلیغ کرنے والا معیار سے بہت ہی گرا ہوا ہے۔ میں اسلامی یونیورسٹی کے ایک غیر ملکی ڈاکٹر کو بتا رہا تھا کہ اس آیت کی یہ تعبیر ممکن ہے، تو وہ جواب میں مجھ سے کہنے لگا کہ ہاں، ہو تو سکتی ہے مگر ہم یہ جرأت نہیں کر سکتے۔ ذرا سطحی پن کا تصور کریں۔

اُدھر، جس شخص کو اللہ کے رسولؐ نے تاویلِ قرآن کی دعا دی ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہہ رہے ہیں کہ: القرآن یفسرہ الزمان ...... ہر زمانہ قرآن کی اپنی تفسیر کرتا ہے۔ اگر میں اپنے علوم اور قرآن کے ساتھ کوئی مفاہمت پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر بڑھتا ہوا زمانہ قرآن سے جدید تر ہے تو خدا پرانا ہو چکا۔ اسے کیوں تسلیم کیا جائے؟ اگر فائیو سٹار ہوٹلز، سکائی سکریپرز اور ناسا کی لیبارٹریوں میں خدا پرانا ہو جاتا ہے تو ہمیں ایسے کسی خدا کی کوئی ضرورت نہیں۔

مگر خدا تو وہ ہے جو قیامت کی پیشین گوئی کر کے کتاب بند کر کے بیٹھا ہے۔ جو ابتدا کی

خبر دے چکا ہے اور کہتا ہے تمہیں نہیں معلوم کہ زمین و آسمان پہلے ایک Mass تھے؟ پھر ہم نے جبراً، زور سے انہیں پھاڑ کر جدا کر دیا۔ یہاں سے وہ آغاز کرتا ہے اور آخر میں یوں بتاتا ہے۔ اذا الشمس کورت واذالنجوم انکدرت جب سورج ماند پڑ جائے گا، ستارے گدلے پڑ جائیں گے، زمین اپنی کشش ثقل سے نکل جائے گی اور چاند اور سورج پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔ جو اتنی سائنٹیفک تفصیل میں آپ کو انجام بتا رہا ہے، وہ خدا کیا درمیان کی تخلیق سے نا آشنا ہو گا؟ نہیں پتہ کہ انٹلیکچول کہاں پہنچیں گے؟ کیا اسے خبر نہ ہو گی کہ کوانٹم کی تھیوریاں کیا ہوں گی؟ Relativity کیا ہو گی؟ کیا اسے پتہ نہ ہو گا American progressive thought یا Genentic سائنس دان کہاں پہنچیں گے۔

جو اللہ دابۃ الارض کی بات کرتا ہے، کیا اس خدا کو علم نہیں کہ جینیک تجربات کہاں تک جائیں گے؟ جس کا رسولؐ یہ فرماتا ہے کہ دجال کے پاس ایک شخص جائے گا اور کہے گا کہ کیا تو میرے لیے میرا بھائی زندہ کر سکتا ہے؟ وہ ہاں کرے گا اور اس کے لیے اس کا بھائی زندہ کر دے گا۔ اصحابؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ کیا یہی ہو گا؟ فرمایا نہیں۔ اس کی مثال ہو گا۔ اس کی بہتر وضاحت کلوننگ کے سوا کوئی اور ہو سکتی ہے؟ انسان کی کلوننگ ہونے والی ہے۔ جاؤ، اپنا مرا ہوا بھائی، بھتیجا، ماں باپ اور بچے بنوا لو۔ آپ کو اپنی Replacements مل جائیں گی۔ آخری اور تازہ ترین جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ قرآن و حدیث نشاندہی کر بیٹھے ہیں۔ پھر کون کہتا ہے کہ اسلام فرسودہ ہے؟ فرسودہ تو وہ ہے، جو اسلام کی نمائندگی کر رہا ہے۔ جو میٹرک فیل ہے جسے قرآن زبردستی حفظ کرایا گیا اور چار روٹی کی طلب پر لگایا گیا۔ آپ لوگ اگر قرآن اور خدا کو اپنا حصہ نہیں دو گے۔ اگر آپ کی جدت خیال خدا کی طرف نہیں مڑتی۔ آپ کی ندرت کے تصورات اللہ کو نہیں مانتے اور اگر ہارورڈ کی یونیورسٹیوں میں خدا نہیں پایا جاتا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم لوگ مناسب چیزوں کو مناسب وقت نہیں دے رہے۔ آپ اپنے کو اس احمقانہ پیروی کے حوالے سے چیلنج نہیں کر رہے۔

ہم تو نفس کے مارے ہوئے ہیں۔ زمانے کی ہر چیز ہم پر مسلط ہو چکی ہے۔ آپ اس میں کیا دیکھتے ہیں، جب سارا دن ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں؟ سارا دن فحاشی میں گذر جاتا ہے۔ اس معاشرے کا حال اس عرب معاشرے سے بڑھ کر تو نہیں، جہاں ماؤں کو لوگ بیویاں بنا

لیتے تھے۔ جہاں ننگے لوگ گھنٹیاں بجاتے، ڈانس کرتے ہوئے طواف کعبہ کرتے تھے۔ کیا اس سے بڑھ گیا ہے یہ زمانہ؟ اگر اس زمانے میں پیغمبر آسکتے تھے اور اس جیسے معاشرے میں پیغمبر خدا شمع ہدایت وعلم روشن کرسکتے تھے، تو اب اتنی مایوسی کیوں؟ لیکن ذمہ داری میری نہیں، آپ کی ہے۔

مولوی اور صوفی کے مظاہر

یہ ایک تعلیمی ڈگری ہے۔ جیسے ایک پانچویں جماعت اور پی ایچ ڈی میں بڑا فرق ہے۔ اسی طرح صوفیا میں کہا جاتا ہے کہ عارف ہمیشہ عالم ہوتا ہے، لیکن عالم ہمیشہ عارف نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر اگر میں عارف یا صوفی ہوتا، تو میں یہ دعویٰ ضرور کرتا کہ میں مذہب کی تمام شاخوں سے آگاہ ہوں۔ مذہب کم از کم آٹھ شاخوں پر محیط ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ، اسماء الرجال اور حدیث کی پرکھ کا علم ہے؟ اس کے علاوہ سیرت اور مواضع ہے اور یہ ساری چیزیں اکٹھی حاصل کیے بغیر آپ اچھے مذہبی اسکالر نہیں ہوسکتے مگر اس کے برعکس جب ہم اپنے عالموں سے ملتے ہیں تو، انہیں تاریخ میں بہت کمزور پاتے ہیں، بلکہ ان کے ہاں خرافات کی روایات جمع ہیں۔ فقہ میں فقیہہ سرے سے ناپید شے ہے کیونکہ فقہ ایک اعلیٰ ترین اور ایک مذہب کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ خشیت کی جو تعریف ابن عباسؓ نے کی کہ محدث وعالم کثرت روایت وکثرت مذہب سے نہیں بنتا، بلکہ خشیت سے بنتا ہے۔ جس خشیت کو کہا گیا کہ اللہ سے ڈرو، وہ یہ خوف نہیں ہے کہ اللہ مجھے مارے گا یا میں اللہ کو غصے میں دوستا بیٹھوں گا۔ خشیت کا اصل مطلب یہ ہے کہ ہر اس کام سے پرہیز کیا جائے، جس کے بارے میں یہ گمان ہو کہ یہ آپ کو خدا سے دور کردے گا۔ اہل دل اس کام سے ضرور ڈرتے ہیں، جو انہیں خدا کی محبت سے ذرا دور لے جائے۔ محبت کے چھن جانے کو خشیت کہتے ہیں۔

اللہ نے قرآن مجید میں ایسے لوگوں کے تین درجے رکھے ہیں۔ وہ جو کم اعمال رکھتے ہیں، جو درمیان میں ہیں اور جو خیر کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور ان کے لیے سابقون الاولون کا نام استعمال کیا گیا۔ اس طرح بعض جگہ قرآن مجید نے کہا کہ الا انا اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولاھم یحزنون، اللہ کے اولیاء اور دوستوں کی پہچان یہ ہے کہ ان پر خوف اور

حزن نہیں ہوتا۔ یہ لفظ صوفی صرف Lingustic addiction ہے۔ اس کو ہم بار بار اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ Being more current the modren time آپ اسے صوفی کہتے ہیں۔ اگلے بندے کے خیال میں فوری یہ ادراک چلا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے بارے میں احساسات میں سپیشلسٹ ہوسکتا ہے۔ فرض کریں، اس کی بجائے آپ یہ کہیں کہ یہ ولی اللہ ہے، تو ولی اللہ زیادہ گمبھیر تاثر چھوڑتا ہے۔ ہم نے لفظ ولی کے ساتھ اتنی طاقت اور مناسبتیں تخلیق کر رکھی ہیں کہ صوفی کا لفظ بھی ولی اللہ کے لفظ کو Comensate نہیں کرتا، لیکن کسی کو کیا پتہ کہ ولی اللہ کتنی مرتبہ دن میں گناہ کرتا ہو۔

جہاں تک اللہ کے نزدیک کیٹیگریز اور درجات کا تعلق ہے، اللہ نے فرمایا، نــرفــع درجــات مــن نشا، جس کے میں چاہتا ہوں، درجے بلند کرتا ہوں۔ و فوق کل ذی علم علــیــم، کہ ہر علم والے کے اوپر علم والا ہے۔ اب تصوف میں بھی سب سے بڑے صوفی کو عارف کہتے ہیں۔ یہ لفظ عموماً غیر مستعمل ہے۔ آج تک کسی نے کسی کا تعارف نہیں کرایا کہ جناب یہ عارف ہیں۔ یہ اتنا بڑا درجہ ہے اس میں دوسرا بڑا حجاب یہ ہے کہ کوئی شخص خود اپنے آپ کو اللہ کا ولی نہیں کہلا سکتا۔ ولایت کا ادعا آدمی کے اپنے پاس نہیں ہے۔ یہ دعویٰ ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کون اس کا ولی ہے اور کون نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ساری زندگی کوئی آدمی اللہ کے ولی کے تاثر کو پورا کر رہا ہو اور وہ ولی شیطان نکلے۔ کیونکہ شیطان کے بھی اولیاء ہیں۔ اولیاء رحمان کی طرح اولیاء طاغوت بھی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں سب کچھ بتایا ہوا ہے۔ عبادت احسان اسی کو کہتے ہیں۔ اخلاص، ایمان، احسان، تینوں تصوف کے معنوں میں آتے ہیں مگر ہم ان کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ نہیں کرتے۔ اگر ہم قرآن کے لفظوں میں کسی بندے کی سند کا ذکر کریں، تو ہم کہیں گے کہ یہ اللہ کا ولی ہے مگر وہ لفظ شاید باعث شرمندگی بن جائے، اگر وہ خود کہتے، میں اللہ کا ولی ہوں۔ حالانکہ یہ ایک عام آدمی بھی دعویٰ کرسکتا ہے۔ کہہ سکتا ہے کہ تم شیطان کے ساتھی ہو، میں اللہ کا ولی ہوں۔ مطلب ہے، میں اللہ کا ساتھی ہوں، دوست ہوں۔

مگر ہمارے معاشرے کے تناظر میں اور خاص طور پر ہمارے برصغیر کی تہذیب میں یہ لفظ اتنا بڑا ہوگیا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی یا شیخ علی بن عثمان ہجویری اور معین الدین چشتی سے کم کسی شخصیت پر لفظ ولی اللہ نہیں ہوسکتا۔ اس وجہ سے اسے لفظ احترام سمجھ کر استعمال نہیں کیا

جاتا۔ جبکہ صوفی عمومی سا لفظ ہے۔ اس میں اتنا احترام انوالو نہیں ہوتا۔ حالانکہ صوفی میں بھی Sophistication ہے۔ صوفی کا لفظ چار رستوں سے آیا ہے۔ ایک تو یونان کے ٹیچر چلتے پھرتے علم دیتے تھے۔ ان کو Sophists کہتے تھے۔ بہت سارے علماء فکر کا خیال ہے کہ Sophists بعد میں صوفی ہوتے تھے۔ استاد اچھا وہی ہوتا ہے، جو بیٹھ کے نہ پڑھائے۔ گھومتے پھرتے جہاں جاتا ہے، رستے میں اس کا ہر قدم علم کا قدم ہوتا ہے۔ جہاں سے گذر جاتا ہے تھوڑی بہت تعلیم دیتا جاتا ہے۔ تو ایک خیال یہ ہے کہ صوفی Sophists سے نکلا ہے۔

دوسرا نبی اکرم ﷺ کے دور میں جو غریب احباب تھے، ان کا بدترین لباس اس وقت اونٹ کے بالوں کا بنا ہوتا تھا۔ اس کو لباس صوف کہتے تھے۔ جو لوگ اسے پہنتے تھے، ان کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ انتہائی غریب ترین لوگ ہیں۔ مذہب میں جدو جہد کر رہے ہیں۔ ان کو بھی صوفی کہا کرتے تھے۔ تیسرے وہ ماہرین تعلیم تھے جو بالکل غریب تھے۔ وہ صبح و شام حضور ﷺ کی خدمت میں رہتے تھے۔ بھاگتے دوڑتے ہوئے کام کرتے تھے اور قرآن و حدیث کا تھوڑا بہت علم رکھتے تھے۔ ان کو اہل صفہ کہتے تھے۔ یہ اصحاب اہل صفہ تھے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور دیگر اصحاب انہی لوگوں میں سے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ نہیں کفش بردار رسول کہتے تھے۔ ان کے طرز پر چلنے والوں کو صوفی کہتے تھے۔

آخری قسم کے بارے میں میرے استاد محترم سید علی ہجویر فرماتے ہیں کہ اہل صفا کو صوفی کہتے ہیں۔ یہ لفظ ان کے لیے ہے، جو صفائی قلب کے لیے جدو جہد کرتے ہیں۔ جن کی جدو جہد ہے کہ ساری زندگی وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی یاد کے ساتھ اپنے دل کو صاف کر سکیں۔ ان میں سے کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جو غیر مذہبی یا غیر اسلامی ہو یا مذہب کے حوالے سے غیر قدرتی ہو۔ سوائے جن کو ہم یونانی فلاسفی میں Sophists کہتے ہیں، لیکن اس زمانے کے Sophists بھی مذہبی ہوتے تھے۔ ڈاؤنی سی ایس، ڈائی جی نس یا زینو ڈی سٹوئیک آف ایلیا اپنے اپنے زمانے کے اولیاء ہی تھے۔

بابے اور رومانٹسزم

مشینی دور میں بابے کا تصور ایک ذہنی سہولت ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ بعض اوقات

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ بابوں کا کچھ زیادہ ہی ذکر کر رہے ہوتے ہیں، انہیں شاید توقع ہوتی ہے کہ زندگی کے کسی موڑ پر انہیں بھی کسی نہ کسی طرح بابا سمجھ لیا جائے۔ ممتاز مفتی صاحب زندہ تھے اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے اور جنت سے نوازے۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ نے یہ بابا شاہ کا کو کی روایت غلط لکھی ہے۔ اسی کے ساتھ اسلام آباد میں سکوٹر والا واقعہ بھی غلط لکھا گیا ہے۔ میں نہیں جانتا، آپ نے اسے کیوں لکھا؟ مفتی صاحب پریشان ہوئے، انہوں نے اشفاق صاحب سے جا کر کہا، پروفیسر صاحب نے کیسے یہ سمجھ لیا کہ یہ دونوں واقعات غلط ہیں۔ انہوں نے وہاں جا کر یہ بھی کہا کہ پروفیسر صاحب کے ارد گرد ایک ہالہ (Aura) ہے۔ میں نے بے شمار مرتبہ انگلیاں ادھر ادھر ماری ہیں، مجھے تو وہ ایسا ہالہ نظر نہیں آیا۔ یہ مفتی صاحب کی اپنی سوچ ہے۔

اصل میں اس دوران پیرا سائیکو جیکل انسٹی ٹیوشن کا کچھ علم اور مذہب تصوف ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئے ہیں۔ جیسے عظیمیہ سلسلے کے ایک بزرگ نے بہت ملاوٹ کی ہے۔ بہت سارے تبت کے لامائی تصورات اور افریقہ کے شامان کے تصورات اسلامی تصوف میں ملائے ہیں۔ اس سے اسلام کا عمومی تصوف کا تصور کافی مبہم ہو گیا ہے۔

ہماری اصل مشکل یہ ہے کہ ہم صوفیاء کو ان کے اعلیٰ ترین پیڈسٹل سے دیکھتے ہیں۔ ہم ایک آدمی کو اس لیے صوفی نہیں کہتے کہ وہ شیخ عبدالقادرؒ یا عثمان علی ہجویریؒ نہیں ہوتا، لیکن آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی پچاس پچاس برس کی زندگی اس کانسپٹ تصور سے گذرتی ہیں اور اللہ ان کو مخلوقات عالم میں محبوب کر دیتا ہے۔ وہ خود شہرت کی تلاش نہیں کرتے۔ شیخ عبدالقادرؒ پچیس برس پہلے کیسے جا کر اعلان کرتے کہ میں ولی ہوں، مجھ کو مانو۔ وہ کبھی ایسا نہ کرتے اور کوئی بھی ولی ایسا نہیں کرتا۔ کوئی شخص اپنے ولی ہونے کا تشخص نہیں ابھارتا۔ یہ لوگوں اور خدا پر ہے جو کسی کی محبوبیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان سے صوفی کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ صوفی انتہائی نا طاقت وجود ہوتا ہے۔ اگر اس کے وجود میں اثر ہے تو یہ اللہ کی مہربانی ہے۔ وہ تو اپنے آپ کو ذاتی طاقتوں سے فارغ کر رہا ہوتا ہے۔ تبھی وہ خدا کے پیچھے ہوتا ہے۔ حضورؐ کی دعا ہے: یا حی یا قیوم برحمتک استغیث کہ اے اللہ! اپنی رحمت سے میری مدد فرما۔ و اصلحنی شان کلہ اور میرے تمام حالات کی اصلاح فرما ولا تکلنی الانفسک طرفۃ عین اور اے اللہ ایک نفس

جھپکنے کے بھی مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر۔ صوفی تو یہ دعا مانگ رہا ہوتا ہے۔

اب اگر ایک صوفی یہ کہے کہ مجھ میں یہ اور وہ طاقت ہے میں یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا، تو ایک عمومی معیار کے مطابق وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔ جب مجھ سے مفتی صاحب نے پوچھا کہ یہ دو واقعے آپ نے کیسے جانے؟ میں نے کہا کہ یہ صوفی ازم کی لائن کے مطابق نہیں ہیں۔ صوفی کوئی پیشین گوئی نہیں کرتا اور نہ دعویٰ کرتا ہے۔ تاہم صوفیوں میں فرق دعا کی قبولیت کا ہوتا ہے۔ کسی کی دعا سال کے بعد سنی جاتی ہے کسی کی چھ مہینے کے بعد، کسی کی مہینے بعد اور کسی کی منہ سے نکلتے ہی سنی جاتی ہے۔ دعا کی پہنچ ہی ان کا فیصلہ کرتی ہے۔ تصوف فی الوجود صوفیاء کے نزدیک بے معنی ہے کیونکہ خداوند کریم نے آگ کی نوعیت کو پیغمبر کے لیے تبدیل کر دیا۔

اب مجموعی طور پر صوفیاء کے روحانی اور تعلیمی معیار بھی کم ہو گئے ہیں۔ حالانکہ یہ Most top intellectual order کا سکول ہے۔ اس میں میں کسی وہم اور وسوسہ کی گنجائش نہیں پاتا۔ اس میں کسی تعویذ، دھاگے یا کسی جادو کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں توحید کے بارے میں شیخ جنید کی تعریف دیکھ لیں، پوری زندگی صرف ہو جاتی ہے۔ کسی نے پوچھا، توحید کیا ہے، تو فرمایا، توحید قدیم کو حاضر سے علیحدہ کرنے کا نام ہے۔ یعنی Separating the eternal from the accidental ایک ہی قدیم ہے اور وہ اللہ ہے۔ باقی سب Accidental ہیں۔ اسلام اسی توحید کا سبق دیتا ہے۔

ایک شخص گھوڑے پر بیٹھا تھا، اس کا کوڑا نیچے گر گیا۔ اس نے ایک شخص سے کہا، مجھے کوڑا اٹھا دو۔ حدیث کے مطابق آپ نے فرمایا، بہتر ہوتا، اگر تو نیچے اتر کے لے لیتا۔ ایک نے مدد کے لیے کہا، تو آپ نے فرمایا، تجھے مدد تو دے رہا ہوں، مگر بہتر ہوتا تو اللہ پر توکل کرتا۔ اس طرح اللہ پر اعتبار اور اعتماد کے عملی سبق سکھائے گئے۔

حضرت براؓ ابن مالک کے بارے میں روایت ہے کہ وہ بڑے برے حال میں آئے۔ صوف کے لباس میں تھے۔ جوتوں سے بو اٹھ رہی تھی۔ کپڑے گندے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ گرد و غبار میں اٹے بڑی دور سے آئے تھے۔ اصحاب رسولؐ کے سامنے آئے۔ حضورؐ نے یہ عالم دیکھ کر فرمایا کہ کچھ لوگ اس عالم میں آتے ہیں، بظاہر وہ بڑے غیر صاف لگتے ہیں اگر وہ قسم اٹھا لیں، تو خدا ان کی قسم ہر حالت میں پوری کرتا ہے۔ یہ وہ براؓ تھے جب مسیلمہ کذاب پر

مسلمانوں نے آخری حملہ کیا، تو ہر مرتبہ براُبن مالک سے کہا جاتا، آپ قسم اٹھائیں کہ کل فتح نصیب ہوگی۔ جب دو چار مرتبہ کہا گیا، تو براُبن مالک نے کہا، آپ نے اللہ کے رسول ﷺ کی دعا کی، جو میرے حق میں تھی، کو مذاق بنا دیا ہے۔ میں قسم اٹھاتا ہوں کہ کل قلعہ فتح ہوگا اور میں قسم اٹھاتا ہوں کہ میں کل شہید ہو جاؤں گا اور دونوں باتیں پوری ہوئیں۔

وہ بڑے عجیب وغریب لوگ تھے۔ ان کی ترجیحات بالکل کلیئر تھیں۔ ان کے نقش پر چلنے کے لیے عقل کے بغیر اتنی ہائی لیول Inte grity پیدا ہی نہیں ہوتی۔ یہ اعلیٰ ترین کمٹمنٹ ہے۔ اگر قدم قدم پر معجزے ہوتے ہیں، تو انہیں آپ معجزے نہیں کہیں گے۔ یہ اصحاب کے لیے بڑی قدرتی چیز تھی۔ خدا کے پیغمبروں کے لیے تھی۔ وہاں خدا تھا اور وہ ان کے ساتھ تھا۔

سعد بن ابی وقاص قادسیہ کی فتح کو گئے۔ دریا بہت بڑا اور طغیانی پر چڑھا ہوا تھا۔ سامنے ایرانی بڑے خوش تھے۔ سعد بن وقاص نے ادھر ادھر دیکھا اور کہا، کون میرے ساتھ آتا ہے۔ انہوں نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ جب باقی لوگوں نے دیکھا کہ سردار نے چھینک دیا ہے، تو انہوں نے بھی چھینک دیا۔ پورے کا پورا لشکر دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا، تو ایک آدمی کے پاس صرف ایک لوٹا گم ہوا تھا۔ جب پارسیوں نے دیکھا کہ یہ لوگ اتنے سمندر اور طغیانی میں دریا عبور کر رہے ہیں، تو پکار اٹھے، دیواں آمدند، دیواں آمدند اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اسی طرح آج بھی ہم دعا حزب البحر پڑھتے ہیں، جو حضرت علاء الحضرمی کی ہے۔ حضر موت کی فتح کے وقت بیچ میں ایک جھیل آ گئی۔ یہ جھیل کے کنارے کھڑے تھے اور جھیل بڑی گہری تھی۔ حضرت علاء نے کہا، میں تو چلا ہوں، میں نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے اپنا گھوڑا جھیل میں ڈال دیا۔ باقی سارے بھی پیچھے گئے اور یہ معرکہ بڑا مشہور ہوا۔ انہوں نے جیتا۔ اگلا اطمینان سے گاؤ خر کا شکار کر رہا تھا۔ مطمئن تھا کہ یہ لوگ کہاں جھیل پار کر کے نکل سکتے ہیں۔ اس موقع پر جو کلمے علاء نے پڑھے، یا علی یا عظیم یا حلیم یا علیم، وہ ابھی تک حزب البحر کا آغاز ہیں۔

اگر اللہ ہے اور اس کی طاقتیں وہی ہیں، جو مختلف کتب ہائے علم میں مذکور ہیں، تو کون اسے نقصان پہنچا سکتا ہے، شکست دے سکتا ہے۔ یہ ہماری اپنی کمزوریاں ہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں، تو ہمارا ایمان کم تر اور گھٹیا ہوگا۔ وہ اس درجہ اعتقاد تک نہیں پہنچ رہا۔ اسی لیے یہ ساری خرابی پیش آ رہی ہے۔ خدا خود کہتا ہے و انتم الاعلون ان کنتم صادقین مگر وہ کہتا ہے۔ ام

حسبتم تدخل الجنته تم گمان کرتے ہو کہ میں تم کو یونہی جنت میں داخل کر دوں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا، یا تکم مثل الذین خلو من قبلکم اس سے پہلے بھی میں نے بہت ساری قوموں کو بڑی شدت سے مستہم الباساء و ضراء و زلزلوا، بیماریوں، دکھوں اور بہت ساری چیزوں سے آزمایا۔ حتی یقول الرسول والذین آمنو معو ایمان والے تو دور کی بات ہے، پیغمبر تک پکار اٹھے کہ متی نصر اللہ کہاں ہے تیری نصرت؟ اے اللہ تو کہاں ہے؟ تو اتنا بڑا اور اتنا پاور فل ہے یہ جو ہم چیخ چلا رہے ہیں، کب سے تیری عبادت کر رہے ہیں، وہ تیری مدد کب پہنچے گی۔ فرمایا، ان نصر اللہ قریب، بہت قریب ہے۔ صرف ایک جھٹ کا اریا ہی اس میں حائل ہے۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون کس حد تک مجھ پر اعتبار کرتا ہے اور اگر آپ اس کے اعتبار کے دشت میں کامیاب ہو جائیں، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو کسی شے کا محکوم نہیں کر سکتی۔